مالیات میں
اسلامی ہدایات کی تطبیق

پروفیسر محمد نجات اللہ صدّیقی

مالیات میں اسلامی ہدایات کی تطبیق

پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ انسانی زندگی میں معاش کی اور معاشی زندگی میں مالیات یا فنانس اور بینکنگ کی کیا اہمیت ہے۔ اس کے بعد ہم قرآنِ کریم کی معاشی تعلیمات کے مطالعہ کے ساتھ یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ نبی ﷺ نے معیشت، بالخصوص مالیات کے میدان میں کیا اصلاحات کیں اور ان احکامات اور اصلاحات کے مقاصد کیا تھے۔ چوں کہ ہمارا مقصد آج اپنی معاشی زندگی اور مالیات کو اللہ کی مرضی کے مطابق ڈھالنا ہے اس لیے ہمارا اگلا قدم یہ ہوگا کہ اپنے زمانہ کی معاشی اور مالیاتی صورتِ حال کو سمجھیں اور ان طریقوں کو دریافت کریں جن سے موجودہ حالات میں وہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہوں جن کو اسلامی دور کے آغاز میں حاصل کیا گیا تھا۔ ایسا کرنا اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ساتویں صدی عیسوی میں جزیرۃ العرب میں پائے جانے والے معاشی حالات اور ان کی مناسبت سے اختیار کیے گئے فنانس کے طریقوں کو جانتے ہوں، اور اسلامی احکامات اور اقدامات کو ان کے تاریخی سیاق میں سمجھ سکیں۔

عصرِ حاضر میں معیشت اور مالیات کے میدان میں مطلوبہ اصلاحات کی تفصیلات مرتّب کرنے میں جہاں اس باب میں مقاصدِ شریعت کو سمجھنے کی اہمیت ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ عہدِ رسالت کے بعد سے انسان نے اپنے ماحول، معاشی امور اور مالیات وتمویل کے

بارے میں جو نئی معلومات اور بصیرتیں حاصل کی ہیں انھیں سامنے رکھا جائے۔ اسی لیے ہم اس بات کی بھی وضاحت کریں گے کہ اسلامی احکام و ہدایات کے متن کو سمجھنے کے لیے اس متن کے زمانی اور مکانی سیاق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

معاشی زندگی کی اہمیت

معاش کی اہمیت ایک بدیہی بات ہے۔ اس کی مزید تاکید سورۂ بقرہ آیات ۳۰ تا ۸۳ کے مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ ان آیات میں انسان کو زمین میں خلیفہ بنا کر بسانے کا اعلان ہے۔ اسی سیاق میں فرمایا گیا:

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ (۱)

اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔

اسی سیاقِ استخلاف میں سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ط قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (۲)

ہم نے زمین میں تمھیں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمھارے لئے یہاں سامانِ زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر کرتے ہو۔

استخلاف کے تصوّر کے ساتھ ابتلاء کی حقیقت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے، جسے ان الفاظ میں واشگاف کیا گیا:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ز وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ○ لا الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ○ لا (۳)

نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔

---

(۱) البقرہ:۳۶ (۲) الاعراف:۱۰ (۳) الملک:۱-۲

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ﳲ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۠ (۱)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے، تا کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

استخلاف اور ابتلاء، دونوں کا تقاضا ہے کہ آدمی ٹھیک سے رہے، اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھے، اپنی رہائش کے ساز سامان اکٹھا کرے، نقل وحمل کا بندوبست کرے، وغیرہ۔ قرآنِ کریم کی متعدّد آیات میں انسان کو جتایا گیا ہے کی اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے کائنات کو ان تمام وسائلِ حیات سے مالا مال کرر کھا ہے، یہ اہتمام انسان ہی کے لئے کیا گیا ہے، بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیت میں صراحت ہے، آزمائشِ حیات وسائلِ حیات کے برتنے ہی میں مضمر ہے! قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات انسانوں کو دیئے گئے معاشی وسائل کے ذکر، ان کے عطا کرنے والے، یعنی اللہ تعالیٰ کے شکرادا کرنے کی یاددہانی، اور ان وسائلِ حیات کے حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق و احتیاجات کی پوری رعایت ملحوظ رکھنے کی تاکید پر مشتمل ہیں۔

معیشت میں فنانس کی اہمیت

انسانی معیشت کے ابتدائی دور میں ہر خاندان اپنی غذا، لباس اور سر چھپانے کی جگہ وغیرہ کا اہتمام خود کرتا تھا۔ پھر تجربے نے تقسیم عمل اور اختصاص division of labor and specialization کے فوائد سے آگاہ کیا۔ اب مبادلہ exchange کا رواج ہوا۔ شروع شروع میں اشیاء کا اشیاء سے مبادلہ barter ہوتا رہا، پھر اس کی دشواریوں نے کسی ایک چیز یا چند چیزوں کو ذریعہِ مبادلہ medium of exchange کے طور پر استعمال کی ترغیب دی اور اس طرح زر

(۱) الانعام:۱۶۵

money. کا رواج ہوا۔ زر کی اکائی نے مختلف اشیاء کی قدر ناپنے اور ان کے باہم موازنے کو ممکن بنا دیا۔ چونکہ زر کے پیچھے سماج میں سیاسی طاقت رکھنے والے، فرد یا ادارے، کی سند بھی تھی اس لئے رواج زر نے یہ بھی ممکن بنا دیا کہ حال میں پیدا کی گئی دولت میں سے کچھ کو مستقبل کے لئے بچا کر رکھا جا سکے۔ بچت کو زر کی شکل میں رکھنے نے اس بات کو بھی آسان بنا دیا کہ اسے کسی دوسرے کو منتقل کیا جا سکے۔ کچھ لوگ دوسروں کی بچت سے اپنی ضروریات پوری کرنا چاہتے ہیں اور کچھ اسے حاصل کر کے اس کی مدد سے مزید دولت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے وہ تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت وغیرہ کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ بچت بہت سے لوگ کرتے ہیں، ان کو حاصل کر کے کاروبار میں لگانے کے خواہش مند تھوڑے لوگ ہوتے ہیں۔ فنانس نام ہے بچت کاروں کے سرمایے کی کاروباری افراد اور اداروں کی طرف منتقلی کے عمل کا۔ اس منتقلی سے افزائشِ دولت میں مدد ملتی ہے۔ دولت بڑھتی ہے تو خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے، آبادی بڑھتی ہے، بازار میں وسعت آتی ہے، اشیاء اور خدمات میں تنوّع پیدا ہوتا ہے۔ نئی ایجادات، ابداع وابتکار کا عمل تیز تر ہوتا ہے۔ تقسیم عمل اور اختصاص اور آگے بڑھتا ہے، جس کے نتیجہ میں فنانس کی طلب اور بڑھتی ہے۔ بچت کاروں اور کاروباری لوگوں کے درمیان راست رابطہ کی دشواریوں کے پیش نظر درمیانی واسطے intermediaries وجود میں آتے ہیں۔ مالیاتی واسطوں financial intermediaries کا کام بڑی تعداد کی بچتوں کو جمع کر کے، سرمایہ کے طالب افراد اور اداروں تک پہنچانا ہے۔ بینک بھی انہی مالیاتی واسطوں میں سے ایک ہیں۔ میوچول فنڈ mutual funds استثمار کے ادارے investment companies اور اسٹاک اکسچینج stock exchange بھی یہی عمل بجالاتے ہیں۔ انسانی معیشت کے پھیلاؤ اور ترقّی میں فنانس کی بڑی اہمیّت ہے، کیونکہ اس طرح روزگار میں اضافہ، وسائلِ قدرت کے بیش از بیش استعمال، اور پیداوارِ دولت میں اضافہ کا عمل آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اسلام اس عمل کی ہمّت افزائی کرتا ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدّد آیات میں تجارت کی

ہمّت افزائی کی گئی ہے، مالیاتی توسّط financial intermediation بھی تجارت میں داخل ہے۔انبیاءِ کرام کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے ابتدائی خودکاری پر مبنی معیشت سے بعد تک کے اجراآت۔۔ تقسیم عمل اور اختصاص، مبادلہ، زر کے استعمال، مالیاتی وساطت، وغیرہ کو صادکیا، ان میں حصّہ لیا۔ یہ ارتقاء ہو یا زراعت، صنعت وحرفت اور تجارت میں ہونے والی تبدیلیاں، یہ فنّی امور ہیں۔انبیاء کرامؑ ان میں اسی طرح شریک رہے جیسے دوسرے انسان، جیسا کہ قرآن میں حضرتِ داوٗدؑ اور حضرتِ سلیمانؑ کے بارے میں بیان ہوا ہے۔انبیاء کا مشن فنّی نہیں اخلاقی رہا ہے۔وہ عدل وقسط اور توازن کے ساتھ رہنا سکھانے آتے رہے تھے۔

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ(۱)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور لوہا اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔

جیسا کہ فارابی سے آج تک مسلمان فلاسفہ اور دانشور جتاتے رہے ہیں، معاشرہ کی سیاسی تنظیم میں انسان کی معاشی احتیاجات کا بڑا دخل رہا ہے۔اسی طرح مرد اور عورت کے یکجا ہونے، خاندان بننے اور اگلی نسل کے پروان چڑھنے، یعنی انسان کے معاشرتی نظام کی جڑیں بھی اس کی معیشت میں پیوستہ ہیں۔ یہاں ہمیں نہ سیاسی نظام پر بات کرنی ہے نہ معاشرتی نظام پر۔ ان کے ذکر کا مقصد صرف یہ ہے کہ معیشت کی بنیادی اہمیّت واضح ہو اور اس میں فنانس کے کلیدی رول کو سمجھا جاسکے۔

اوپر فنانس کے اوّلین کردار کا ذکر آیا، مالی وساطت: یعنی لاکھوں کروڑوں افراد اور اداروں کی بچتوں کو ان سیکڑوں ہزاروں تاجروں صنّاعوں اور مزارعین وغیرہ اہلِ کاروبار تک پہنچانا جو سرمایہ کے طالب ہوں۔فنانس کا ایک اور اہم کام کاروبار میں درپیش عدم تیقّن اور خطر

(۱) الحدید:۵۲

risk and uncertainty کا سامنا کرنے، انھیں انگیز کرنے اور ان کے اثرات و عواقب سے عہدہ برآ ہونے میں مختلف افراد اور اداروں کے درمیان اشتراکِ عمل اور تعاونِ باہمی کا اہتمام کرنا ہے۔ اکثر اوقات کاروبار میں درپیش خطرا اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اکیلا کاروباری ان کو اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا، مگر بہت سے لوگ تمویلِ کاروبار میں شریک ہو کر اس خطر کا تحمل ممکن بنا دیتے ہیں۔ دورِ جدید میں اکثر کاروباری اعمال کثیر سرمایہ کو طویل عرصہ کے لیئے لگانے کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کے کاروباری نتائج بڑے عدم تیقّن کا شکار رہتے ہیں۔ مالیاتی کارپوریشن لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں حصص فروخت کر کے اتنا زیادہ سرمایہ جمع کر لیتے ہیں کہ ایسے کاروبار کیئے جاسکیں۔ چونکہ یہ حصص بازارِ مالیات میں خرید فروخت کے قابل ہیں اس لیئے کسی کو بھی لازماً اپنی رقم طویل مدّت کے لیئے پھنسانا ضروری نہیں۔ اگر ایسا بڑا کاروباری منصوبہ ناکا ہو جائے تو بھی ناکامی سے ہونے والا نقصان اتنی بڑی تعداد میں بٹ جاتا ہے کہ لوگ اسے آسانی سے برداشت کر لے جاتے ہیں اور معاشی ترقّی کا عمل جاری رہتا ہے۔ جیسے جیسے معیشت ترقّی کرتی جاتی ہے مالیات کا یہ کام، یعنی خطر اور عدم تیقّن سے عہدہ برآ ہونے میں مدد کرنا اس کے اوّلین کام، یعنی مالی وساطت سے زیادہ اہمیّت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اہم تر بات یہ ہے کہ مالی وساطت اور خطر اور عدم تیقّن سے عہدہ برآ ہونے کے یہ کام اس طرح انجام پائیں کہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوں، کسی طرح کی حق تلفی اور ظلم نہ ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عدل کے ساتھ احسان کی آمیزش ہو تا کہ انسان کے ماحول environment میں جو نا قابلِ تخمین عدم تیقّن پایا جاتا ہے اس کے منفی اثرات سے وہ لوگ بھی محفوظ رہیں جو اپنی ناداری یا معذوری کی وجہ سے مالیات کے کاروباری رشتوں میں منسلک ہونے سے قاصر ہیں۔

اسلامی ہدایات

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کی خاطر اسلام نے کچھ احکام وضوابط دیئے ہیں۔ ربا اور قمار کی حرمت اور غررِ کثیر سے پرہیز کے علاوہ عام اخلاقی اصول: بولو تو سچ بولو، تو لو تو پورا تولو، وعدہ

پورا کرو، معاہدے نہ توڑو، دھوکہ نہ دو، خیانت نہ کرو، ادھار یا قرض لو تو ادائگی کرو، مقروض کے ساتھ نرمی برتو، وغیرہ۔ احتکار کی حرمت، مجبور گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر دام بڑھا نا، نیلام میں دام بڑھانے کے لیئے جھوٹی بولی بولنا، وغیرہ سے اجتناب کی ہدایات کا منشاء فریقین کو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے باز رکھنا اور باہمی لین دین کو دونوں کے لئے سودمند بنانا ہے۔

مذکورہ پابندیوں کے پہلو بہ پہلو وہ تعلیمات ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اپنے مفاد کی تحصیل و تکمیل کے ساتھ دوسرے انسانوں کی بہبود کا بھی لحاظ رکھو، ان کے مفادات کی رعایت ملحوظ رکھو۔

اسلام نے باہمی تعاون کی تمام شکلوں کی ہمت افزائی کی ہے بشرطیکہ اس تعاون باہمی کا مقصد درست ہو، سماج یا اس کے کسی فرد یا گروہ کو نقصان پہنچانا نہ مقصود ہو۔ اسلام میں تجارت کو تعاون باہمی کی ایک شکل گردانا گیا ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی کو اللہ کا فضل قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فنانس کی فراہمی یا مالی وساطت کو بھی تعاونِ باہمی کی ایک شکل سمجھنا چاہیئے۔

نبی ﷺ نے اس کی جو شکلیں رائج پائیں ان کو، مذکورہ بالا ہدایات الٰہی کی روشنی میں، غیر اخلاقی عناصر سے پاک کیا۔ ادھار لین دین جاری رہا، جیسا کی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۲ (آیت مداینہ) سے ظاہر ہے۔ نقد رقم قرض کے طور پر دینے کو بھی روا رکھا گیا، مگر آج ایک رقم دے کر کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کو اضافہ کے ساتھ واپس کرنے کے مطالبہ یعنی سود کو منع کر دیا گیا۔ ابتدائی دور کی زرعی معیشت میں فنانس کی فراہمی اور زراعت کی تمویل کا ایک طریقہ سَلَم کا تھا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ جو یہ طریقہ اختیار کرے اسے چاہیئے کہ غلّہ دینے کا وقت اور اس کی مقدار واضح طور پر طے کرے۔ یہ طریقہ مصنوعات کے سلسلہ میں اختیار کیا جائے تو استصناع کہلاتا ہے۔ شرکت اور مضاربت بھی مالیاتی تعاون کی شکلیں ہیں۔ یہی حال مزارعت اور مساقات کا بھی ہے۔ تمویل کا ایک قدیمی طریقہ اجارہ، یعنی زمین، مکان، بار برداراری کے جانوروں، آلات زراعت وغیرہ کو کرائے پر دینا ہے۔ تمویل کی ایک پرانی معروف شکل تجارتی کریڈٹ یعنی مال کی ادھار فراہمی بھی ہے۔ یہ تمام طریقے جاری رہے البتہ ان کو غرر، معلومات کی ایسی کمی جو فریقین کے درمیان جھگڑے کا سبب بن سکتی ہو، اور وقت، قیمت وغیرہ کے بارے میں ابہام جیسی خرابیوں سے پاک رکھنے کی تاکید کی گئی۔

اکثر اوقات جو گاہک مال آج اٹھانا چاہتا ہے مگر دام ایک عرصہ کے بعد ادا کرنا چاہتا ہے اس سے مال بیچنے والا اس دام سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے جو ہاتھ کے ہاتھ نقد ادا کرنے کی صورت میں لیا جا رہا ہو۔ ادھار دام کے نقد دام سے زیادہ ہونے کی اس ریت میں شریعت نے کوئی خرابی نہیں پائی۔ اس کی حکمتوں پر بہت سے لوگوں نے روشنی ڈالی ہے۔ آج کچھ نقد دے کر ایک عرصہ کے بعد اس سے زیادہ لوٹانے کے مطالبہ میں نہ صرف یہ کہ وہ فوائد نہیں پائے جاتے بلکہ صریح ناانصافی پائی جاتی ہے۔ جو مال گاہک اٹھاتا ہے اس سے کچھ فائدے براہِ راست وابستہ ہیں، جب کہ نقد کے فوائد اسی وقت سامنے آسکتے ہیں جب اس سے کوئی مال خریدا جائے۔ اس خریدے ہوئے مال سے استفادہ کے بعد، جب قرض کی واپسی کا وقت آتا ہے تو نقد ادائگی کے لیے پھر مال بیچنا پڑتا ہے۔ اس طرح جو نقد ملے وہ قرض لئے نقد سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے اور کم بھی۔ اس خطرہ سے قرض دینے والا کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا بلکہ قرض دی گئی رقم کو سود کے اضافہ کے ساتھ واپس چاہتا ہے۔ اسلام نے اس مطالبہ کو رد کرتے ہوئے اسے ظلم قرار دیا ہے:

وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ج لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (۱)	اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

واضح رہے کہ ادھار کی شکل میں ایک بار جو دام طے پایا اس میں کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ بالفاظِ دیگر، ایک طرف تو اس شکل میں فروخت کنندہ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ مال دینے اور موعودہ وقت ادگی کے درمیان جو زمانی وقفہ ہو، مطلوبہ دام میں اس کی رعایت ملحوظ رکھے۔ اور دوسری طرف خریدار پر واجب الادا رقم اس طرح متعیّن ہوگئی کہ اب اس میں کوئی اضافہ ممکن نہیں، بلالحاظ اس کے کہ دام کب ادا ہوتے ہیں۔ مزید وقت کے عوض خریدار سے مزید رقم کا مطالبہ ممکن نہیں۔ رہا دام کی ادائگی میں دانستہ تاخیر کا معاملہ، تو اس کے سلسلہ میں دوسرے طریقے اختیار کئے جاسکیں گے، جن میں عدالتی چارہ جوئی بھی شامل ہے۔ نبی ﷺ نے قدرتِ ادائگی کے باجود دام دینے میں ٹال مٹول کو ظلم قرار دیا ہے، فرمایا: مطل الغنيِ ظلمٌ۔

---

(۱) البقرۃ:۲۷۹

ماہرین کی رائے میں اس بات نے کہ ادھار کے دام نقد دام سے زیادہ ہو سکتے ہیں اسلامی سماج کو سود کے خلاف جمے رہنے میں بڑی مدد دی ہے، تجارت کی توسیع اور کاروبار کی تمویل میں مسلمانوں کو سود سے پرہیز کی وجہ سے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

دور جدید میں اسلامی فنانس میں مرابحہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس میں بھی اس بات سے بڑا فائدہ اٹھایا گیا کہ ادھار دام ہاتھ کے ہاتھ دیئے جانے والے دام سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

خطر اور عدم تیقّن کا سامنا اور جوئے کی حرمت

زندگی کچھ ایسی ہے کہ انسان کو قدم قدم پر غیر یقینی حالات کا سامنا ہے۔ کاروباری زندگی میں اسی سبب نفع کی امید کے ساتھ نقصان کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے۔ جب بات تمویل کی ہو تو یہ کیفیت اور نمایاں رہتی ہے۔ تمویل کا خاصّہ ہے کہ مال آج لگایا جائے اور نتائج ایک عرصہ بعد سامنے آئیں۔ درمیانی عرصہ میں حالات بدل جا سکتے ہیں، بازار کے بارے میں جن اندازوں اور تخمینوں کی بنیاد پر کاروباری منصوبہ بنایا گیا تھا وہ غلط ثابت ہوتے ہیں، وغیرہ۔ اس صورتِ حال میں سب سے عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ معاملہ کے فریق، مال لگانے والے اور کاروبار کی تنظیم عمل میں لانے والے، خطر انگیزی میں شرکت risk-sharing کا راستہ اختیار کریں۔ مضاربت، مزارعت، مساقاۃ، اور شرکت کی قدیم سے رائج شکلیں سب اسی طرح کے تعاونِ باہمی کی شکلیں ہیں۔ لیکن کچھ اصحابِ سرمایہ نے ہمیشہ یہ چاہا کہ خطر انگیزی سے دور رہیں پھر بھی ان کے سرمایہ کی واپسی مع سود ہو۔ یہ risk-shifting ہے جسے ظلم قرار دے کر منع کر دیا گیا۔ اس ممنوع طریقہ کا جوہر یہ ہے کہ تمویلِ کاروبار کے نتائج کے غیر متعیّن اور غیر متیقّن ہونے کے باوجود مال فراہم کرنے والے متعیّن یقینی اضافہ (منافع) کا مطالبہ کریں۔ اس مطالبہ کے نتیجہ میں سارا خطر فریقِ ثانی کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ جس قدر خطر صاحبِ مال کو اٹھانا تھا اس کو بھی وہ دوسروں کو منتقل کر دیتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کے اسلام نہیں چاہتا کہ تحویلِ خطر risk-shifting کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

خطر انگیزی کے سلسلہ میں ان دونوں طریقوں کے علاوہ بھی کچھ طریقے ہیں جن کے بارے میں گفتگو درکار ہے۔ مگر پہلے خطر اور عدم تیقّن کی ماہیت پر کچھ اور غور ضروری ہے۔ علماء کے نزدیک ایک طرف تو خطر اور غرر کے مابین گہرا ربط ہے اور دوسری طرف غرر اور جوئے، یعنی میسر کے درمیان بھی ربط ہے۔ ضروری نہیں کہ جہاں غرر ہو وہاں جوا ہو، مگر جوئے کی تمام شکلوں میں غرر ضرور پایا جائے گا۔ غرر یہ ہے کہ معاملے سے متعلق اہم باتیں لامعلوم، یا غیر متعیّن ہوں۔ اہم باتوں میں قیمت، وقت اور مقامِ ادائگی، فروخت کئے جانے والی چیز کے مواصفات، مقدار، اور ہر وہ معلومات شامل ہے جس کا معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے فیصلہ پر اثر پڑ سکتا ہو۔ جب یہ نقص ایک ہی فریق کے لئے ہو، اور کم، نا قابلِ لحاظ ہو تو معاملہ کر لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ جب دونوں فریق اندھیرے میں ہوں اور غرر کا اثر بڑا ہو جس کا فریقین یا کسی ایک فریق کے مفادات و مصالح پر قابلِ لحاظ اثر پڑ سکتا ہو تو شریعت نے معاملہ کرنے سے منع کیا ہے اور اسے میسر قرار دیا گیا ہے جس سے روکا گیا ہے۔

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ o اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ o[1]	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور اور نماز سے روک دے۔

جوئے بازی اور کاروبار میں خطر انگیزی کی نوعیت میں جو فرق اوپر واضح کیا گیا اسی کے ساتھ یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ جوئے بازی سے سماج کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، بس ادھر کی دولت ادھر ہوتی ہے۔ اصطلاحی طور پر اسے zero-sum game کہا جاتا

---

(۱) المائدہ: ۹۰-۹۱

ہے۔ اگر لوگ کاروبار میں خطر انگیزی سے اجتناب کرنے لگیں تو کاروبار ٹھپ ہو جائیں، ترقّی رک جائے اور انسانی تمدّن زوال کا شکار ہونے لگے۔ اس کے برعکس جوئے سے اجتناب سے کھلاڑی اس لذّت سے ضرور محروم ہوں گے جو جوا کھیلنے سے وابستہ ہے مگر سماج کی مجموعی دولت پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا کیوں کہ جوئے بازی پیداواری عمل نہیں ہے۔ مستزاد یہ کہ اس کے نتیجے میں سماج میں دولت کی تقسیم پر جو اثر پیدا ہوتا ہے اور جس طرح پیدا ہوتا ہے وہ منفی جذبات پروان چڑھاتا ہے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر نقل کی گئی آیتِ کریمہ میں آیا ہے۔

تاریخ اور فقہ کی کتابوں میں کچھ ایسے معاملات کا ذکر آیا ہے جو اس لئے ممنوع قرار پائے تھے کہ وہ غررِ کثیر پر مبنی تھے یا جوئے بازی کے مرادف تھے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ان کے مطالعہ اور تجزیہ کے بعد یہ طے کریں کہ آج کے رائج معاملات میں سے کن معاملات کو منع کرنا چاہئے۔ یہ کام بہت کم ہوا ہے۔ اسی لئے یہاں اختصار کے ساتھ پہلے پرانی شکلوں کا ذکر کیا جائے گا پھر معاصر مالیاتی نظام کے بعض غور طلب معاملات سامنے لائے جائیں گے۔

جوئے کی نمایاں مثال گھڑ دوڑ یعنی گھوڑوں کی ریس horse race میں بازی لگانا ہے۔ پہلے نمبر کا گھوڑا جیتا تو زید ایک لاکھ عمر کو دے گا، دوسرے نمبر کا گھوڑا جیتا تو عمر دولاکھ زید کو دے گا۔ مروّجہ ریسیں، کرکٹ پر سٹہ بازی، وغیرہ اس کی معاصر مثالیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو پرندہ ابھی ہوا میں اڑ رہا ہو اس کی خرید فروخت نہ کرو۔ تالاب کی ساری مچھلیوں کا سودا درست نہیں، جو بچھڑا ابھی گائے کے پیٹ میں ہو اس کی خرید فروخت جائز نہیں۔ غرر کثیر اور دوطرفہ عدم معلومات کی بنا پر اکثر فقہاء نے ان تینوں معاملات کو ممنوع قرار دیا، مگر امام ابوحنیفہ نے تالاب کی مچھلیوں کے سودے کی اجازت دی کیوں کہ ممانعت سے زحمت بڑھتی ہے اور اجازت میں سب کے لئے سہولت ہے۔ ہر شبہ سے بالا انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ باغات کے پھلوں کی تھوک خرید فروخت اس وقت عمل میں آئے جب پھل پک جائیں۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے میں سب کا نقصان ہے کیوں کہ اکثر پھل سڑ جائیں گے۔ باغات خریدنے

والوں کو خریدنے اور تیّار پھلوں کو بازار میں لاکر فروخت کرنے کے لئے وقت چاہئے۔ چنانچہ آپ علیہ وسلم صلی اللہ نے اجازت دے دی کہ پھل نمودار ہو جائیں مگر پکے نہ ہوں تو بھی ان کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شریعت کا منشاء یہ ہے کہ معاملات ممکنہ حد تک معلومات پر مبنی ہوں۔ مگر جہاں مکمّل معلومات کے انتظار میں متعلّقہ مفاد یا مطلوبہ مصلحت ضائع ہونے جارہی ہو وہاں اس اصل کی تعبیر اور تطبیق میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔

معاصر بازارِ مالیات میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جو ناقص معلومات پر مبنی ہیں مگر ان سے سہولت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔ صرف یہ نوٹ کیا جاسکتا ہے کہ مسئلہ پیچیدہ ہے۔ کام صرف کسی بنے بنائے ضابطہ کی تطبیق کا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ متعلّقہ مصالح کی ترویج اور ممکنہ مفاسد سے بچنے کی قابلِ عمل شکل کیا ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی بازارِ مالیات میں رائج طریقوں کا مجموعی اثر سماج کے کلّی مصالح: عدل، استقرار اور ترقّی، شخصی سطح پر سکون وطمانینت، معاشرتی سطح پر ربط وتماسک، اور عالمی سطح پر امن۔۔۔۔ پر کیا پڑتا ہے۔ کسی بھی طریقِ تمویل کے جائزہ میں ان کلّی امور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ کام مشکل ہے اور اس میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔

مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر معاملات میں منفعت اور مضرّت دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جہاں مضرّت کا پہلو بہت نمایاں ہو وہاں شریعت معاملہ سے منع کر دیتی ہے، جیسا کہ شراب اور جوئے کے بارے میں فرمایا گیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (۱)

پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لئے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

زندگی کے بہت سے معاملات میں ہمیں جو انتخاب کرنا ہوتا ہے وہ ملی جلی چیزوں میں

(۱) البقرہ:۲۱۹

سے کسی ایک کا کرنا ہوتا ہے۔خاص طور پر مالی معاملات میں ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک طرف بے آمیز نفع ہو،ایسا طریقہ جو انسانی مصالح کا فروغ عمل میں لائے مگر اس کے ساتھ کسی مفسدہ کا اندیشہ بالکل نہ ہو۔اور دوسری طرف تمام تر خسارہ،ایسا طریقہ جو صرف موجبِ فساد ہو،جس سے کسی کی کوئی مصلحت نہ وابستہ ہو۔جن معاملات کو ردّ کرنے یا قبول کرنے کا سوال سامنے آتا ہے ان میں اکثر منفعت اور مضرّت،دونوں پہلو نظر آتے ہیں۔فیصلہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ کون کم ہے کون زیادہ،کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم۔یہی وجہ ہے کہ آج کل اسلامی فنانس کے باب میں مروّجہ طریقوں کے درمیان اخذ و ترک،مطلوبہ ترمیم و اصلاح،وغیرہ کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

کاروباری جدّ وجہد اور پیداوری عمل کی ہمّت افزائی

کسبِ مال اور تمویل،نیز متعلّقہ سرگرمیوں کے بارے میں اسلامی تہذیب و تمدّن کا مزاج شروع سے ہی ایجابی اور فعّال رہا۔نبی ﷺ خود تاجر تھے اور ان کا تجارتی عمل تمویل و استثمار کی شکل میں کارِ نبوّت کے ساتھ بھی چلتا رہا۔آپ کے قریبی ساتھی،جن میں سے بعض آپ کے خلیفہ چنے گئے،اپنی کاروباری مہارت اور اپنی کمائی کے لئے مشہور ہیں۔چنانچہ جن دس صحابیوں کو اللہ کے رسول نے ان کی زندگی ہی میں جنّتی ہونے کی بشارت دی ان میں سے تین بڑے مالدار تھے:عثمانؓ،زبیرؓ بن العوّام اور عبدالرحمٰنؓ ابنِ عوف۔(ان لوگوں نے اسلام کی راہ میں بڑی داد و دہش کی اور بڑے رفاہی کام کئے)۔ذاتی مصارف کے بارے میں بھی کوئی بڑی روک ٹوک نہیں البتہ حرام کی گئی اشیاء سے دور رہنا لازم ہے۔اس کے ساتھ ہی قرآن،کریم میں اسراف اور تبذیر کی ممانعت آئی ہے۔اسراف یہ ہے کہ جس قدر تکمیل ضرورت کے لئے درکار ہو اس سے زیادہ خرچ کیا جائے اور تبذیر یہ ہے کہ جس کام پر خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے اس پر خرچ کیا جائے۔ان ہدایات کی ایک تعبیر و تفصیل تو وہ ہے جو مقبولِ عوام خطبوں اور قصّے کہانیوں میں سامنے آتی ہے۔دوسری وہ ہے جو مستند لٹریچر:کتبِ سیرت،حدیث و شرحِ حدیث،تفسیر

وتاریخ کی کتابوں سے سامنے آتی ہے۔ تیسری وہ ہے جو مسلمانوں کے رہن سہن، ان کی تعمیرات، اور فی الجملہ ان کے کلچر سے سامنے آتی ہے۔ معاصر دنیا میں اسلامی زندگی کے لئے ان تینوں سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہاں اس کی تفصیل ہمارے موضوع کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن اس کا تعلّق مالیات سے بھی ہے لہٰذا اسی تعلّق کی نسبت سے کچھ باتیں سامنے رکھی جائیں گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ مسئلہ اضافی ہے۔ حرام سے بچنے اور مباحات کے دائرے میں رہتے ہوے انسان کیا کھائے کیا پہنے، کیسا گھر بنائے اس کا تعلّق اس سے بھی ہے کہ کسی زمانے میں کسی ملک میں کیا وسائل دستیاب ہیں۔ بعض وعظ گو اسلام کے ابتدائی دور میں، جزیرۃ العرب کے بعض مقامات کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ آج یہ مثالیں بلا ترمیم، ان ہی مقداروں اور مواصفات کے ساتھ اخذ کرنا اس لئے مطلوب نہیں کہ اس زمانے میں اہل عرب کو بہت کم وسائل حیات میسّر تھے۔ آج صورتِ حال بہت مختلف ہے۔ جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوے اور اس کے بعد بھی کپڑے بیچنے کا اپنا ذریعہِ معاش جاری رکھنا چاہا تو ان سے کہا گیا کہ ان کی کفالت بیت المال مسلمین سے ہوگی تا کہ وہ اپنا سارا وقت کارِ خلافت میں لگا سکیں۔ ان کے لئے ایک جوڑا کپڑا جاڑے کا اور ایک جوڑا گرمی کا دینا طے پایا۔ یہ بات عدل اور حکمت دونوں کے خلاف ہوگی کہ آج کوئی من وعن یہی عمل دہرانے پر اصرار کرے۔

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنی ذاتی آسائش کے علاوہ بھی انسان بہت سے اخراجات کرتا ہے جن کے بارے میں حسبِ موقع اس پیمانے سے مختلف پیمانے اختیار کرنے ہوں گے جو خالصۃً آسائشِ نفس کے لئے اختیار کیے جاتے ہوں۔ ان اخراجات میں رفاہی کاموں اور فی سبیل اللہ انفاق کے علاوہ بیوی بچّوں اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق اور والدین کو خوش رکھنا شامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان کی اپنی کارکردگی میں اضافہ کرنے والے اخراجات کی بھی الگ اہمیّت ہے۔ اس پس منظر میں اس بصیرت سے بھی فائدہ اٹھانا ضروری ہے جو علمِ معاشیات نے ہمیں فراہم کی ہے: اخراجات سے اشیاء اور خدمات کی طلب بڑھتی ہے، جس کے نتیجہ میں

روزگار میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور افرادِ معاشرہ کی آمدنیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کم خرچی خیرِ مطلق نہیں، بسا اوقات اس روش سے غربت وافلاس وجود میں آنے کا اندیشہ ہے۔

اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اسراف سے متعلق اسلامی ہدایات کی معاصر تعبیر وتطبیق کے کام کو افرادِ معاشرہ کی صواب دید پر چھوڑ دیا جائے اور رہن سہن وغیرہ میں کسی جبر اور ضابطہ بندی سے کام نہ لیا جائے۔ یہی پالیسی ان اخلاقیات کے بارے میں اختیار کی جانی چاہئے جن کا تعلق لین دین، بازار کے طور طریقوں اور دیگر کاروباری اور مالیاتی امور سے ہے۔ اوپر ہم حرام وحلال کے ان حدود کا ذکر کر چکے ہیں جن کو اسلام میں قوانین واجب النفاذ کا درجہ حاصل ہے۔ باقی امور میں نئی ضابطہ بندی کی اس وقت تک ضرورت نہیں جب تک اہم اجتماعی مصالح کے تحفظ کے لئے ایسا کرنا ناگزیر نہ ہو جائے۔ خلافتِ راشدہ کے دور کی بھی ایسی نظیریں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتہادی پالیسی سازی میں مختلف رائیں سامنے آسکتی ہیں۔ ایک بار حضرتِ عمرؓ بازار کا جائزہ لے رہے تھے تو دیکھا کہ حاطب ابن بلتعہ بازار نرخ سے کم پر منقّہ بیچ رہے ہیں۔ آپ نے ان سے کہا، یا تو جس دام سب بیچ رہے ہیں اسی پر تم بھی بیچو ورنہ ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔ گھر پہنچے تو کچھ سوچا اور لوٹ آکر ان سے کہا، میرا کہنا ٹھیک نہیں، تم جس دام چاہو بیچو۔ غالباً پہلے آپؓ نے دوسرے منقّہ فروشوں کے مفاد کے تحفّظ کی خاطر ایک حکم دیا، پھر سوچا کہ منقّے خریدنے والوں کے مفاد کا تقاضا کچھ اور ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اصل پر قائم رہا جائے، یعنی تاجر آزاد ہے، جس دام چاہے بیچے، گاہک آزاد ہے، خریدے یا نہ خریدے۔ (واضح رہے کہ غذائی اجناس کی قلّت کے زمانے میں احتکار کا معاملہ دوسرا ہے، مگر یہاں ان حالات سے بحث نہیں۔) (۱)

نبی ﷺ نے مدینہ کے تھوک فروشوں کو شہر کے باہر سے آنے والے تاجروں سے ان کے بازار میں پہنچنے سے پہلے، راستے ہی میں مل کر سودا کر لینے سے منع کر دیا تھا۔ منشاء یہ تھا کہ بازار پہنچنے پر سودا ہو، تاکہ نہ تو باہر سے مال لانے والوں کو ان کے بازار نرخ سے ناواقفیت کی بنا پر

(۱) ملاحظہ ہو موطّا امام مالک: حدیث نمبر ۲۸۳۲۔ کتاب البیوع۔ باب الحکرۃ والتربص۔ نیز دیکھیے محمد نجات اللہ صدیقی: اسلام کا نظریہ ملکیت صفحہ ۵۱۹۔ دہلی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ ۲۰۰۴ء

دام کم ملیں، نہ شہر کے عام خریداروں کو اس سے اونچے دام دینے پڑیں جو سارے مال کے بازار پہنچنے پر طے پاتے۔

ایسی مثالیں اور بھی ہیں جن سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بازار میں نبی ﷺ یا خلفاءِ راشدین کی مداخلت کا مقصود عدل کا قیام اور احسان کی رعایت ملحوظ رکھنا تھا، حتیٰ الامکان یہ کام انفرادی آزادیوں کو مجروح کئے بغیر کیا گیا۔ معاصر اسلامی زندگی میں بھی اسی اصول کو رہنما بنانا ہوگا۔ جہاں تک متعیّن ضابطوں کا سوال ہے تو ان میں سے اکثر کی اہمیّت حالات بدلنے کے سبب وہ نہیں رہی جو اس زمانے میں تھی، مگر اصول اب بھی اہم ہیں۔ اس سیاق میں اس حدیث کا دیا ہوا سبق بھی بڑا اہم ہے، جس کے مطابق نبی ﷺ نے کھجور کی کاشت کرنے والوں کو نر درختوں کے زیرے مادہ درختون پر چھڑکنے کے عمل سے روکا تھا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ اس عمل کو آپ ﷺ نے توہّمات پر مبنی رسم سمجھا ہوگا۔ نتیجہ میں جب فصل خراب ہوئی اور لوگوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ کیوں خراب ہوئی تو فرمایا کہ اپنے دنیوی معاملات کو تم بہتر سمجھتے ہو۔[1] معلوم ہوا کہ نبی ٹکنکل معاملات نہ جانتا ہے نہ سکھاتا ہے بلکہ حضور اکرم ﷺ تلقین کر گئے کہ ان امور کو ہم اپنی سمجھ کے مطابق انجام دیں۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ مالیات کے میدان میں کیا ٹکنکل ہے کیا عدل واحسان سے بھی متعلّق relevant ہے اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ خاص طور پر خطر اور عدم تیقّن سے نبرد آزمائی میں اکثر اس مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ اس میدان میں ریاضیات اور اعداد وشمار کا استعمال بہت ہے، جس سے کسی کو غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ بھلا اس کا عدل واحسان سے کیا تعلّق ہوگا۔ مگر ان طریقوں کے استعمال سے مناسب قرار دئے جانے کے باوجود بھی جب کسی مالیاتی اسلوب کے نتائج مجموعی طور پر ناپسندیدہ قرار پاتے ہیں تو اس ابتدائی رائے پر نظرِ ثانی ضروری ہو جاتی ہے۔ hedge funds کا مثال کے طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے، مگر اس گفتگو میں ہم اس کی تفصیل میں نہیں جا سکتے۔

---

(۱) صحیح مسلم: حدیث نمبر ۲۳۶۱-۲۳۶۳۔ باب وجوب امتثال ما قاله شرعاً دون ما ذكره عن معايش الدنيا على سبيل الرای۔

معاصر مالیات میں قرض کے استعمال کا مسئلہ بھی بڑا پیچیدہ ہے۔ایک طرف تو ادھار لین دین اور قرض لینے دینے کے جواز میں کوئی شبہہ نہیں۔دوسری طرف احادیث میں قرض لینے کی عادت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔نبی ﷺ کی دعاؤں میں قرض کے بار تلے دب جانے سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے۔مگر یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے ذاتی ضروریات کے لئے بھی قرض لیئے اور اجتماعی (حکومتی) کاموں کے لیئے بھی قرض لیئے۔ایک سادہ معیشت کے سیاق میں، معمولی مقداروں میں قرض کا بظاہر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔مگر معاصر مالیاتی نظام کی اسلامی تنقید میں اس بات کو بڑی اہمیت دی گئی کہ یہ نظام بیشتر قرض کے اوپر قرض جاری کرتے جانے پر مبنی ہے۔حکومتی سطح پر قرض لینے کا ایسا چلن ہوا جس سے غریب ممالک تو قرض کے بوجھ تلے دبے ہی، امریکہ جیسے امیر ترین ممالک بھی قرضوں پر گزر کرنے لگے۔حکومت کے لئے قرضوں کی بعض ایسی شکلیں بھی موجود اور معمول بہ ہیں جن میں اصل کی ادائگی کا تصوّر مفقود ہے۔یہ ہے معاصر صورتِ حال، جب کہ اسلامی معاشیات کے لٹریچر میں یہ کہا گیا ہے کہ سود کی حرمت اور اس حرمت کے سبب قرض یا ادھار پر مبنی تمسّکات کی خرید و فروخت کا بازار گرم ہونے کا ممکن نہ ہونا اس بات کا ضامن ہے کہ اسلامی مالیاتی نظام میں قرض کا رول نسبۃً محدود ہوگا۔

اس پر مستزاد یہ کہ معاصر نظامِ زر monetary system بھی قرض ہی پر مبنی ہے۔جب بھی بنک کسی طالبِ قرض کو قرض دیتا ہے تو اس قرض کے بقدر نیا زر وجود میں آتا ہے۔جب بھی حکومت مرکزی بنک سے قرض لیتی ہے، مرکزی بنک اس قرض کے بقدر نیا زر جاری کرتا ہے۔زر کی رسد و طلب اور قرض کی رسد و طلب ایک ہی سکّہ کے دو پہلو ہیں۔قرضوں کے حجم میں لامتناہی پھیلاؤ اور بازارِ قرض میں قرض کی اصلی ابتدائی قیمت سے مختلف داموں پر خرید و فروخت پر ہماری نکیر تو بہت شدید ہے مگر مروّجہ نظامِ زر و مالیات کا ایسا متبادل جو قرض کے جال سے باہر ہو، اس کا تصوّر ابھی بہت دھندلا ہے۔

میں یہ مسئلہ اس لیئے سامنے رکھ رہا ہوں تا کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ اسلامی ذخیرہ ہدایات میں موجود سرمایہ کے بہت قیمتی ہونے کے باوجود اس سے آغاز کر کے عصرِ حاضر میں تطبیق کے

لائق پالیسیوں تک پہنچنے کا سفر کتنا طویل اور دشوار ہے۔ چونکہ آپ اسی سفر کی تیاری کے طور پر علم حاصل کر رہے ہیں اس لئے آپ کو ان مشکلات و مسائل کا پورا شعور ہونا چاہئے تا کہ آپ کی علمی اور تحقیقی ترجیحات ان میدانی تقاضوں سے مناسبت رکھیں۔

نظامِ زر کا ذکر آ ہی گیا ہے تو دو باتیں نوٹ کرتے چلیں۔ پہلی بات تو ہے کہ نظامِ زر اور نظامِ مالیات دونوں کے درمیان بڑا گہرا ربط ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ان میں سے ایک قرض (یا کریڈٹ) پر مبنی ہو اور دوسرے میں کوئی اور اسلوبِ تعامل کارفرما ہو۔ اگر ہم مالیاتی نظام کو، مروّجہ طریقہ کے مطابق، قرض اور ادھار، اور ان سے متعلّق (نا قابلِ فروخت) وثائق پر قائم کرنے کی بجائے زیادہ تر (قابلِ فروخت) شراکتی وثائق پر قائم کرنا چاہیں تو ہمیں نظامِ زر کے بارے میں بھی اسی ڈگر پر چلنا ہوگا۔ زر کے بارے میں اسلامی اقتصادیات کے ماہرین نے نئے زر کی تخلیق (رسدِ زر میں اضافے) کے بارے میں مختلف رائیں ظاہر کی ہیں۔ ایک رائے صدفی صد ریزرو پر مبنی ہے جس کا مطلب عملاً رسدِ زر کو پوری طرح مرکزی بنک کے کنٹرول میں دینا ہے، نیا زر اب بھی نئے قرض کی صورت میں وجود میں آئے گا لیکن، 100% reserve رکھنے کے پابند ہونے کی بنا پر عام تجارتی بنکوں کو دئے ہوئے قرضوں کی پشت پناہی کے لئے مساوی مقدار میں مرکزی بنک کا جاری کردہ نقد رکھنا ہوگا۔ زر کی رسد گھٹانے بڑھانے کی صلاحیت تمام تر مرکزی بنک کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جائے گی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تجارتی بنک قرضے دینے کی بجائے مضاربت وغیرہ کی بنیاد پر جو سرمایہ طلب گاروں کو فراہم کریں ان کے ذریعہ بھی زر کی رسد میں اسی طرح اضافہ ہو سکے گا جس طرح سرِ دست سودی قرضے دینے سے ہوتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے اندر سوڈان میں اس سمت کچھ پیشقدمی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی وہاں کے مالیاتی نظام میں بھی اسی مناسبت سے اصلاحات عمل میں لائی گئی ہیں۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ مسئلہ کا حل سونے کے معیار gold standard کی طرف واپسی میں ہے۔ متعلّقہ علوم کے ماہرین کی بے توجّہی، مسئلہ کی پیچیدگی، اور اصحابِ اقتدار کے مروّجہ نظاموں پر رضامندی (الّا ما شاء اللّٰہ) ابھی تک اس عقدہ کے حل میں کسی قابلِ لحاظ پیش رفت میں مانع ہے۔

اسلامی ایجنڈے کے جاری کام

نبی کریم ﷺ نے اپنے الوداعی حج کے موقع پر امّت سے جو خطاب کیا اس کی بڑی اھمیّت ہے۔ آپ نے تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس مجمع میں موجود رہے ہوں وہ آپ ﷺ کی بات ان تک پہنچائیں جو وہاں موجود نہیں تھے۔ خطبہِ حجۃ الوداع کا مکمّل متن کسی ایک روایت سے ہم تک نہیں پہنچا ہے بلکہ اس کے مختلف ٹکڑے مختلف روایتوں میں ملتے ہیں۔ صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں، بالخصوص مسند امام احمد میں، زیادہ تر کتاب الحج میں جو بیان ملتے ہیں ان کے ساتھ سیرتِ ابنِ ھشام کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ تاریخ کی کتابیں بھی مفید ہیں(۱) متعدّد اور باتوں کے ساتھ اس خطبہ میں تین ایسے کاموں کا ذکر ہے جنھیں اس اسلامی ایجنڈے کے جاری کاموں میں شمار کرنا چاہئے جو آپ ﷺ کے سامنے تھا۔ ان کاموں کی نوعیّت بتاتی ہے کہ یہ بیک جنبشِ قلم کئے جا سکنے والے کام نہیں ہیں۔ نبی ﷺ ان کاموں کا مؤثر آغاز فرما چکے تھے۔ آگے کے راستے کی واضح نشاندہی فرما چکے تھے۔ اب اس موقع پر آپ نے ان کی اہمیّت جتا دی۔ یہ تین کام ہیں: غلامی کی ذلّت کا خاتمہ، عورت کے وقار کی بحالی، اور سود سے پاک مالی نظام کا قیام۔ اگر چہ اس موقع پر ہمارا مرکزِ توجّہ آخر الذکر کام ہے لیکن بات کو اس کے صحیح پس منظر میں رکھنے کے لئے پہلے دو کاموں کا بھی کچھ ذکر مناسب ہوگا۔

آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: تمھارے غلام! جو خود کھاتے ہو وہی انھیں بھی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ویسا ہی انھیں بھی پہناؤ (۲) ۔۔۔۔

ایک دوسرے موقع پر لوگوں سے کہا: تمھیں کسی کو بھی میری بندی، میری بندی کہہ کر نہیں پکارنا چاہئے، (کیونکہ) تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمھاری ساری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں (۳) ۔۔۔۔

بہت سی قرآنی شہادتوں اور احادیث کی روشنی میں علماء اور مفکّرین کی متفقہ رائے ہے

---

(۱) نیز ملاحظہ ہو: ڈاکٹر نثار احمد، خطبہِ حجۃ الوداع۔ لاہور، بیت الحکمہ ۲۰۰۵ء

(۲) مسند احمد: حدیث نمبر ۳۱۸۵۱

(۳) صحیح مسلم: حدیث نمبر ۹۴۲۲

کہ شریعت کا منشاء بتدریج غلامی کا خاتمہ تھا۔ اس موضوع پر خاصا لٹریچر موجود ہے، یہاں ذکر سے مقصود یہ تھا کہ نبی ﷺ نے مسلم سماج کو جس حال میں چھوڑا وہ اس کی آخری منزل نہیں تھی، منزل کی طرف پیش رفت جاری رکھنا مطلوب ہے۔

یہی حال عورتوں کے انفرادی اور سماجی وقار کو اس سطح تک اٹھانے کا رہا جس کی نشاندہی قرآنی آیات کرتی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (۱)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲)

مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکاۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔

اس موضوع پر بھی خاصا لٹریچر موجود ہے۔ خود اپنے مختصر سے دورِ قیادت و حکمرانی میں نبی ﷺ نے عورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس کی بھی تفصیل ملے گی۔ ان سب کے باوجود حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: آگاہ، تمھیں عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت کی جاتی ہے! (۳)

---

(۱) الحجرات: ۱۳
(۲) التوبۃ: ۷۱
(۳) سنن ترمذی، کتاب الرضاع، باب ما جاء فی حق المرءۃ، حدیث نمبر ۱۱۶۳ عن سلیمان بن عمرو بن الاحوص

یہاں بھی وہی معاملہ ہے۔ آئیڈیل کی طرف سفر طویل ہے!

بازار کو اخلاق کے منافی حرکتوں سے پاک کرنے کی اسلامی مہم روزِ اوّل سے جاری تھی۔ خاص طور پر سود (ربا)۔۔۔ آج قرض دے کر کل اس کی مع اضافہ واپسی کے مطالبے۔۔۔ سے قطعی طور پر منع کیا جا چکا تھا۔ اب اس تاریخی خطاب میں ایک فیصلہ کن اعلان کیا گیا:

جاہلی ربا کالعدم کیا جاتا ہے۔ پہلا (بقایا) سود جسے میں کالعدم کرتا ہوں خود ہمارا سود، (چچا) عبّاس بن عبد المطّلب کا (بقایا) سود ہے۔ وہ پورا کا پورا ساقط کیا جاتا ہے۔(۱)

سیرتِ ابنِ ھشام میں مذکورہ روایت میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں؛ مگر تمھیں تمھارا اصل واپس ملے گا، نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہو۔

معلوم ہوا کہ عبّاسِ ابنِ عبد المطّلب جیسے بڑے کاروباری، سود لیتے بھی تھے اور سود دیتے بھی تھے۔ جس بات کا اعلان کیا جا رہا تھا وہ کسی فردِ واحد کے بقایوں تک محدود نہیں تھی بلکہ پورے نظامِ مالیات سے سود ختم کیا جا رہا تھا۔ یہ بات کہ یہ اعلان اس تطہیرِ مالیات اور تزکیہِ معیشت کے ہمہ گیر عمل کا آخری نشان نہیں تھا جسے نبی ﷺ نے شروع کیا تھا بلکہ صرف اس کا ایک اہم سنگِ میل تھا واضح ہو جاتی ہے جب ہم نبی ﷺ کے اس دنیا سے جانے اور سلسلہِ وحی کے اختتام کے بعد کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسلامی معیشت نے بڑی تیزی سے ترقّی کی، مالیات کے باب میں بڑی وسعت آئی، بڑا تنوّع رونما ہوا۔ نصوصِ کتاب وسنّت کی روشنی میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رہا۔ نئے اسالیبِ تمویل کو، جیسے جیسے وہ سامنے آئے، اس غور وفکر کی روشنی میں جانچا پرکھا گیا۔ اکثر رایوں میں اختلاف رہا، مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ کچھ رایوں کو اکثر اصحابِ علم وتفقّہ کی تائید ملنے سے دوسری رائیں دب گئیں۔ صدیوں تک، جب تک بعض اسباب

---

(۱) صحیح مسلم: کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ

سے اجتہادی عمل اضمحلال کا شکار نہیں ہوگیا، امّت اپنی اقتصادی ترقّی، تجارتی توسیع، اور مالیاتی سرگرمیوں کو پوری نشاط اور انشراح کے ساتھ اسلامی آداب کی جلو میں انجام دیتی رہی۔

پندرہ سو سال پر پھیلی اس تاریخ کا جائزہ اس ایک گفتگو میں لینا ممکن نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کے اندر تلاش و جستجو پیدا ہو۔ مراجع اور مصادر موجود ہیں، جدید بھی اور قدیم بھی۔ ان کا مطالعہ کیجئے۔ تاریخ کے بیان میں بھی اور اس کی تعبیر میں بھی اختلاف کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہیے۔ آج کے بازارِ مالیات کی اصلاح کے لئے فوری قابلِ استعمال نسخوں کی توقّع نہ کیجئے، بلکہ جوھرِ علاج کو اخذ کرنے کی کوشش کیجئے۔ جتنی محنت آپ اسلامی مراجع پر صرف کریں اتنی ہی آج کی دنیا کو، اس کے اقتصادیات کو، اور اس کے مالیاتی نظام کو، جیسا کہ وہ ہے، سمجھنے پر صرف کیجئے۔ تب جا کر آپ اس بحث و تحقیق میں بھرپور حصہ لے سکیں گے جو آج کل جاری ہے۔ اسلامی فقہی مجالس، اسلامی اقتصادیاتی مراکز، اسلامی بنکوں اور دوسرے اسلامی مالیاتی اداروں کے شریعہ بورڈ، اور بہت سے اصحابِ علم ان بحثوں میں شریک ہیں۔

مقاصدِ اسلام اور مالیات میں اسلامی ہدایات کی تطبیق

مالیات کے باب میں اسلامی ہدایات کی تطبیق کا معاملہ آج کی دنیا میں صرف یہی نہیں کہ کہ بنک کاری اور فنانس کے عمل کو سود اور قمار سے پاک کر لیا جائے۔ اصل نظر ان اعلیٰ مقاصد کے حصول پر رکھنی چاہئے جن کے پیشِ نظر سود اور قمار کو حرام کیا گیا ہے، یعنی قیامِ عدل۔ اس راہ میں بنک کاری اور فنانس کی سود اور قمار سے تطہیر کلیدی اہمیّت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر مقصد کی طرف پیش رفت ممکن نہیں۔ لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ بنک کاری اور مالیاتی نظام کو قیامِ عدل کا خادم بنانے کے لئے اور کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام پہلے کام، یعنی بنک کاری اور مالیات کی تطہیر کے کام سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہے۔ سبب یہ ہے کہ یہ کام ہمیں آزادیِ کاروبار اور انفرادی ملکیتوں کے احترام کے ساتھ کرنا ہے۔ سوشلزم اور

اسلام کے اپروچ میں یہ بنیادی فرق بھولنا نہیں چاہئے۔اس سیاق میں اسلامی تحقیق کرنے والوں کے لئے اہم سوال یہ ہے کہ کیا افراد معاشرہ کے تزکیہ، ان کو اسلامی اخلاق و آداب سے آراستہ کرنے کا قیامِ عدل میں کوئی فعّال کردار ہوسکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اسلام کے دورِ زرّیں میں ایسا رہا ہے۔کوئی وجہ نہیں کہ دوبارہ ایسا نہ ہوسکے۔اس اجمال کی قدرے تفصیل مفید ہوگی۔

انسان کے سامنے اپنے مفادات بھی رہتے ہیں، جن کے حصول کے لئے وہ فیصلے کرتا ہے، اور کچھ قدریں بھی جو اس کی رہنما بنتی ہیں۔ مفادات فرد فرد کے مختلف ہوتے ہیں، مگر قدروں سے وابستگی اس سے مختلف ہے۔ سچ بولنا، دیانت داری، انصاف، وعدے وفا کرنا، ناپ تول درست رکھنا، دوسروں کی مدد، ہمدردی، رحم،۔۔۔۔۔۔وغیرہ انسانی فطرت کا حصہ ہیں، مذہبی تعلیمات ان فطری میلانات کو قوی تر بناتی رہی ہیں۔اسلامی عقائد اور تعلیمات نے ان کو بہت تقویت بہم پہنچائی ہے۔

اخلاق کا تعلّق انسان اور انسان کے مابین رشتوں، نیز انسان اور اس کے ماحول environment کے درمیان تعامل سے ہے۔ ماحول میں حیوانات، نباتات اور جمادات، سبھی شامل ہیں، ہوا، پانی اور خلاءِ خارجی outer space بھی انسان کے ماحول کا حصّہ ہے۔ روحانیت کا تعلّق انسان اور خدا کے رشتہ سے ہے، اہم روحانی قدروں کے طور پر شکر، انابت و تقویٰ اور توکّل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔اسلام میں اخلاقی قدروں کی جڑیں روحانی قدروں میں پیوستہ ہیں۔انسان اپنے خالق و پروردگار کی محبّت میں اس کی طرف توجّہ کرتے ہوئے، اس کا شکر ادا کرنے کے ایک مظہر کے طور پر جب اپنے بھائی انسان سے معاملت کرتا ہے تو اس کا رویہ اس (سرمایہ دارانہ) رویّہ سے مختلف ہوتا ہے جو دوسرے انسانوں سے کیئے جانے والے معاملہ کو صرف اپنے ذاتی نفع کی ترویج کا ذریعہ بناتا ہے۔تقویٰ شعاری کا تقاضا ہے کہ آدمی دوسرے بندگانِ خدا کو جانتے بوجھتے نقصان نہ پہنچائے۔ مانا کہ عملی زندگی میں اسلام کی عطا کردہ روحانی

اور اخلاقی قدروں کی تعبیریں مختلف ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی درست کہ جب ایک طرف ذاتی دنیوی مفاد ہو اور دوسری طرف اعلیٰ اقدارِ حیات تو کوئی اقدار کو ترجیح دے گا کوئی مفاد کو۔ پھر بھی اس سے انکار ممکن نہیں کہ قیامِ عدل میں روحانی اور اخلاقی تربیت اور قدروں کے فروغ کا ایک رول ہے۔ مگر معاصر علمِ اقتصادیات، اور بنک کاری اور فنانس سے متعلق لٹریچر اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ نہ سرمایہ داری، نہ سوشلزم، کوئی معاصر نظام طاقت کے اس سرچشمہ سے فیض یابی کی تدبیریں نہیں سوچتا جو اخلاقی اور روحانی اقدار سے سیراب ہوتا ہے۔، ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب لمبا ہے۔ اس کے تشفّی بخش جواب کے لئے ہمیں مغربی دنیا میں مذہب اور سائنس نیز چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان طویل کشمکش کی داستان بیان کرنا ہوگی اور مغربی مفہوم میں سیکولرزم کے سارے علوم پر چھا جانے کا پس منظر جاننا ہوگا۔ یہاں اس کا موقع نہیں، ہمیں اس مختصر سی بات پر اکتفاء کرنا ہوگا کہ اسلامی محقّقین کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ وہ زندگی کے کسی بھی میدان میں اخلاقی اور روحانی قدروں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے، نہ علوم کے ارتقاء میں نہ سماج کی تعمیر میں۔ سود کی ممانعت ہو، جوئے کی طرح کی سٹّہ بازی کی روک تھام ہو یا کوئی دوسرے قانوناً قابلِ نفاذ ضوابط، صالح سماج صرف ضابطہ بندیوں کے سہارے نہیں قائم ہوسکتا۔ صرف اخلاق و روحانیت بھی معاشی زندگی کی پاکیزگی کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ اچھّی زندگی دونوں عناصر سے مل کر بنتی ہے۔ اخلاق بھی ضروری ہے، قانون بھی ضروری ہے۔ دورِ حاضر میں مالیات اور بنک کاری کے باب میں اسلامی ہدایات کی تطبیق کا نقشہ بنانے کے لئے آپ کو دونوں کی طرف توجّہ کرنا ہوگی۔

روحانی اور اخلاقی قدروں کی عصری تعبیر ایک بڑا کام ہے جس کا ابھی تک صرف آغاز ہوسکا ہے، ابھی اس کام میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی ہے۔ اس کام کے جو تقاضے متون texts کے فہم اور تاریخ کی چھان بین سے متعلق ہیں ان کی تعیین نسبتہً آسان ہے۔ مشکل تر کام میدانی تجربی تحقیق emperical field research کے ذریعہ اپنے معانی کو معاصرت

contemporariness عطا کرنا ہے۔ اس کے بغیر ہم اخلاق اور قانون کے دائروں کی حدیں نہیں مقرّر کر سکتے کیونکہ یہ حدیں زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ عہدِ نبوی اور خلافت راشدہ میں یہ حدیں کیا تھیں اس بات کو اس دور کے زمانی اور مکانی سیاق context میں رکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سمجھ کے نتائج سے آج استفادہ ضروری ہے مگر اسی حد پر جمے رہنے کی کوشش نہ تو مفیدِ مطلب ہوگی نہ ممکن العمل۔ چنانچہ بعد کی صدیوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جس میں قانون کا سہارا لینے یا اخلاق پر بھروسہ کرنے کے بارے میں پہلے سے مختلف روش اختیار کی گئی۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ جو ضوابط پہلے نافذ کئے گئے تھے ان کو پسِ پشت ڈال کر نیا اپروچ اختیار کیا گیا جو مقاصد، شریعت کی بدلے ہوے حالات میں تحصیل میں مددگار رہوا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے سامنے ایک ایسے صاحبِ ثروت کا معاملہ پیش کیا گیا جس نے زکاۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا، اسے نہ چھیڑو، جب اس شخص تک یہ بات پہنچی تو اسے شاق گزری اور اس نے زکاۃ ادا کرنے کی پیشکش کی، چنانچہ آپ کی اجازت سے اس کی زکاۃ قبول کر لی گئی۔(۱) غور فرمائیے، اگر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے قانون کی فوری اور حرفی تنفیذ پر اصرار کیا ہوتا، یا خلیفۂ رسول ﷺ، حضرت ابوبکرؓ کی تقلید کو ہی اسلام سمجھتے (جنھوں نے بجا طور پر مانعینِ زکاۃ کے خلاف فوجی کارروائی کی تھی) تو کیا نتیجہ نکلتا؟ مگر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نظر مقاصدِ شریعت پر تھی اور وہ اسلامی پالیسی کی تعیین میں اس کے فیصلہ کن مقام سے پوری طرح واقف تھے۔ ان کے دور کے حالات، اس شخص کی نفسیات، اور ایک انفرادی حالت کو کسی غیر معمولی اقدام کی بنیاد بنانے سے فتنہ ابھرنے کا اندیشہ۔۔۔ معلوم نہیں کیا کیا مصالح ان کے سامنے تھے جو انھوں نے ایک مانعِ زکاۃ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔

چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد کی صدیوں میں بغداد میں کئی بار ایسی صورتِ حال سامنے آئی کہ بازار میں غذائی اجناس کی قلت کے سبب ان کی قیمتیں آسمان سے بات کرنے

---

(۱) موطا امام مالک: زکاۃ حدیث نمبر ۲۳

لگیں۔اس صورتِ حال کے پیش نظر متعدّد فقہاء نے فتویٰ دیا کہ حکومت غذائی اجناس کی قیمتیں مقرّر کر سکتی ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بازار میں مال لانے پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار نبی ﷺ کے عہد میں مدینہ میں اشیاء کے نرخ چڑھ گئے تھے اور لوگوں نے آپ سے قیمتیں مقرّر کرنے کی درخواست کی تھی تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔[1] ایک ہی مظہر اشیاءِ خوراک کی گرانی، کے سلسلہ میں نبی ﷺ کے فیصلہ سے ہٹ کر فیصلہ! جیسا کہ آپ کو متعلّقہ مراجع کے مطالعہ سے معلوم ہوگا، اس کا مدار اس پر تھا کہ نبی ﷺ کے سامنے جو صورتِ حال تھی اس کا سبب قدرتی تھا، مدینہ میں غذائی اشیاء کی باہر سے رسد میں کمی آ گئی تھی، تیسری صدی کے بغداد میں گرانی کا سبب احتکار (ذخیرہ اندوزی) اور تاجروں کی نفع خوری تھی۔ جو سبق ہمیں ملا وہ یہ کہ اسلامی ہدایات کی تطبیق کوئی میکانیکی عمل نہیں۔ان کے فہم، اپنے حالات کو سمجھنے، اور مقاصدِ شریعت کو سامنے رکھ کر موزوں پالیسی وضع کرنے کے لئے علم کے ساتھ حکمت بھی درکار ہے۔

حرفِ آخر

بات ختم کرنے سے پہلے یاد دلانا ہے کہ آپ کس کام کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔ یہ کام فقیہ اور مفتی کے کام سے مختلف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کام آپ کو کرنا ہے وہ فقیہ اور فتویٰ دینے والوں کے کام سے زیادہ وسیع اور بڑا، بہت بڑا ہے۔آپ کو قانون سازی نہیں کرنی ہے، نہ آپ سے یہ مطالبہ ہے کہ معاصر دنیا میں قابلِ نفاذ احکام مرتّب کر دکھائیں۔آپ سے وہ کام مطلوب ہے جو جدید اصطلاح میں سوشل سائنٹسٹ کا کام ہے۔آپ کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وجود میں آنے والی تہذیب کے پس منظر میں معاصر دنیا کو سمجھنا ہے۔آپ کو انسانی فطرت، اس کے ابدی عناصر اور زمان ومکان کے ساتھ بدلتے رہنے والے جوانب، سب کا احاطہ کرتے ہوئے

---

(۱) تفصیل کے لیئے دیکھئے محمد نجات اللہ صدیقی: اسلام کا نظریہ ملکیت۔ بارھواں باب۔ دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۲۰۰۲ء

عصرِ جدید کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ معاشیات، بالخصوص فنانس کے تعلّق سے درپیش مسائل ومشکلات کی ایک جھلک دکھاؤں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو کام کی اہمیّت کے ساتھ خود اپنی قدر وقیمت کا بھی احساس ہوگا۔ ایک تاریخ ساز کام ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگے بڑھنے کی توفیق دی ہے۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو آپ کے اساتذہ کو اور اس کام میں شریک تمام افراد کو اپنی امداد سے سرفراز فرمائے۔